خلیل طوقار

عصر حاضر میں اردو کے مسائل اور ان کے حل کی جستجو: ترکی اور دوسری قومی زبانوں کے تجربات کی روشنی میں[1]

''اردو زبان: پاکستان کی قومی زبان، پاکستانیوں کی قومی شناخت کی پہچان، بھارت میں ہندو۔مسلم اتحاد کی علامتِ درخشاں، اقلیم ہند کی عالی معیار تہذیبی اور ادبی زبان، شعر و شاعری کی روح رواں، اجنبیوں کو اپنا فریفتہ بنانے والی شیریں اور اثر آفریں لسان!'' زبانِ اردو سے متعلق یہ خوش آئند الفاظ جو رسمی، علمی اور ادبی تحریروں اور تقاریر میں بار بار دہرائے جاتے ہیں، کچھ ایسی حقیقتوں کو بیان کرتے ہیں جن سے انکار ممکن نہیں، لیکن اردو سے محبت کرنے والوں کے اِن بیانات کے باوجود، آج بھی اردو زبان کے سامنے مسائل کا مشکل گزار پہاڑ کھڑا ہوا ہے جس کی نوک دار چوٹیوں سے کاروانِ اردو کو گزارنے کے لیے اِس کے شیدائی برسوں سے جد و جہد کر رہے ہیں۔

عصر حاضر میں اردو زبان کے مسائل کیا ہیں اور اُن کا حل کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟ یہ سب ایسے سوالات ہیں جن پر برسوں بحث و مباحثے ہوئے ہیں اور جن کی چارہ جوئیاں کی گئی ہیں لیکن پھر بھی اِن مسائل کی کالی گھٹائیں اردو زبان کے مطلع سے صاف نہیں کی جا سکی ہیں۔ اِس لیے محبانِ اردو کی اردو کے مسائل کو حل کرنے کی یہ کوششیں آج بھی جاری ہیں۔ دراصل اس موضوع پر بات کرتے کرتے اب تو ایسا لگنے لگا ہے کہ اِس پر مزید بات کرنے کی گنجائش نہیں رہی ہے، تاہم جب تک یہ مسائل حل نہیں ہو جاتے اُن پر گفتگو ہوتی رہے گی، اور یہ گفتگو واقعتاً اتنی لمبی چوڑی ہے کہ اگر ہم اُس کے تفصیلی بیان میں جائیں تو ہمارا یہ بیان داستانِ امیر حمزہ سے کم نہیں ہوگا۔

مفصل بیان کو مختصر بنانے کی خاطر مَیں یہاں اپنے خیالات استفساری انداز یعنی سوالیہ اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں ابتدا اِس سوال سے کرتا ہوں کہ عصر حاضر میں اردو زبان کے کیا کیا مسائل ہیں؟

یہ ایک دو نہیں بلکہ بہت سارے ہیں۔ ہم اردو کے چند غایت درجہ اہم مسائل کو اردو کے بارے میں منفی

---

[1]۔ یہ مضمون دسمبر ۲۰۱۱ میں کراچی میں منعقدہ بین الاقوامی اردو کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا۔

خیال رکھنے والوں کی زبانی یوں بیان کر سکتے ہیں:

یکم۔ اردو سرکاری اور عدالتی زبان نہیں بن سکتی کیونکہ سرکار اور عدالت کی زبان برطانوی عہد سے لے کر آج تک یعنی صدیوں سے انگریزی زبان ہی رہی ہے اور تمام کارروائیاں ایک زمانے سے انگریزی میں ہوتی چلی آ رہی ہیں اِس لیے اِس محکم بنیاد نظام کو سرے سے ختم کر کے اُس کی جگہ اردو کو قائم کرنا از حد مشکل ہے۔

دوئم۔ اردو جدید سائنس اور ٹیکنیک کی ضروریات پر پوری نہیں اتر سکتی کیونکہ اردو جدید علوم کے لیے ناکافی ہے۔

سوم۔ انگریزی کے بغیر ترقی ناممکن ہے اِس لیے اردو کی تعلیم کی بجائے انگریزی کی تعلیم کو اہمیت دینی چاہیے۔

چہارم۔ کمپیوٹر کے جدید دَور میں اردو کو استعمال کرنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ یا خود انگریزی استعمال کرنی ہوگی یا پھر اردو کو آسان بنانے کے لیے انگریزی حروف استعمال کرنے ہوں گے۔

پنجم۔ اردو پاکستان کی قومی زبان ہونے کے باوجود پاکستانیوں کی مادری زبان نہیں ہے، اِس لیے انگریزی ہو یا اردو پاکستان کے لوگوں کے لیے اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اِن مسائل کے علاوہ اردو کے املا، اردو صحافت سے قارئین کی بے اطمینانی، جوانوں میں اردو سے بے رخی وغیرہ بھی اردو کے مسائل میں شامل ہیں۔ ہاں، یہاں مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ ہندستان میں اردو زبان کی اپنی نوعیت کی مشکلات ہیں لیکن وہ ایک الگ بحث ہے۔

اِن منفی خیالات کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں سوالات کا طوفان اُمڈنے لگتا ہے اور مذکورہ بالا سوالات کی روشنی میں سب سے پہلے میرے ذہن میں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ کیا اردو سرکاری یا علمی زبان نہیں بن سکتی؟ اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور اسی لحاظ سے پاکستان کے بانی قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا:

> میں آپ کو صاف طور پر بتادوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں۔ جو کوئی آپ کو غلط راستے پر ڈالے وہ درحقیقت پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو مضبوط بنیادوں پر متحد و یکجا رہ سکتی ہے اور نہ ہی بحیثیت قوم اپنا کردار ادا کر سکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے۔ پس جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے، پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔

اگر یہ فرمودات ترکی یا کسی دوسرے ملک کے بانی کے ہوتے اور بعد میں آنے والے عہدے دار اس پر

عمل نہ کرتے تو اُن کا انجام مشکوک ہوتا۔

علاوہ بریں ایک زبان کو سرکاری زبان بننے کے لیے اس کا تعلیمی زبان ہونا بھی لازمی ہے کیونکہ اگر ایک زبان کو اسکولوں اور کالجوں میں واحد تعلیمی زبان نہیں بنایا جائے گا تو وہ کبھی بھی اس ملک کی سرکاری زبان نہیں بن سکے گی۔ پاکستان میں کئی وجوہات کی بنا پر اردو کے حق میں یہ کام پوری کامیابی سے نہیں ہو سکا۔ یہ تو اظہر من الشمس امر ہے۔ اس لیے قیام پاکستان کے اِتنے سال بعد بھی یہ کشمکش جاری ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم بن سکتی ہے کہ نہیں؟ حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ آج تک پاکستان میں اردو کے علمی زبان نہ بن سکنے کی دھوم مچائی جا رہی ہے گویا زبانیں خود آسمان سے علمی یا تعلیمی زبان بن کر اُتر آتی ہیں اور علمی زبان نہ بننے کا قصور خود زبان ہی ہے، زبانوں کو علمی اور تعلیمی بنانے میں اس کو بولنے والوں کا کوئی عمل دخل نہیں!

اِس سلسلے میں دوسرا سوال یہ ہے کہ انگریزی نظامِ تعلیم کے مفادات اور نقصانات کیا ہیں؟

اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف پاکستان، ہندستان اور دنیا کے ترقی پذیر مما لک ہی میں انگریزی کو سرکاری زبان یا واحد ذریعۂ تعلیم بنانے کی بحث اٹھتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں کبھی نہیں! ظاہر ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں انگریزی اجنبی یا ثانوی زبان کی حیثیت سے احسن طریقے سے پڑھائی جاتی ہے لیکن اسے اُن ملکوں کی اپنی قومی زبان پر کبھی فوقیت نہیں دی جاتی اور اپنے سروں پر اسے بھوت کی طرح سوار نہیں کیا جاتا ہے۔ پاکستان اور ہندستان میں کہا جاتا ہے کہ صرف انگریزی ہی ہے جس کے ذریعے جدید علم اور فن حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی نہیں تو علم بھی نہیں، ترقی بھی نہیں۔ ابتدائی تعلیم سے اختتامی تعلیم تک اگر انگریزی ہی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے تو بہتر ہے۔ پاکستان اور ہندستان میں بعض مخصوص سماجی طبقوں سے اٹھنے والی اس آواز کی ہم نوائی اِن ملکوں کا وہ متوسط طبقہ بھی کرتا ہے جس کو اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلوانے کی سہولت حاصل ہے اور جو انگریزی کو علم وفن حاصل کرنے کے ذریعے سے زیادہ کمائی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ لیکن جن ملکوں کی غالب اکثریت غربت کے مصائب سہہ رہی ہے ان میں کتنے لوگ اپنے بچوں کو انگریزی کی تعلیم دلوا سکتے ہیں اور ان ملکوں میں بھی جن کی شرح خواندگی کی حالت کسی سے بھی پوشیدہ نہیں؟ اگر تمام اسکولوں میں انگریزی کی تعلیم کامیابی سے مہیا کر بھی دی جائے تو کتنے لوگوں کو حسب ضرورت انگریزی آ جائے گی۔ بیس فی صد، تیس فی صد؟ باقی ستّر، اسّی فی صد کا کیا ہوگا؟ جہاں لوگوں کو اپنی زبان میں پڑھنے لکھنے کی تعلیم حسب ضرورت مہیا نہیں کی جا سکتی ہے وہاں کسی اجنبی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اس لیے اِن ملکوں کی غالب اکثریت انگریزی تعلیم سے دور ہے اور شاید دور رہنا بھی اُس کی قومی بقا کے لیے بہتر ہے۔ آج پاکستان اور

ہندستان میں یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ وہ لوگ جو انگریزی تعلیم حاصل کرکے اس کو اپنی مادری زبان بنانے میں مصروف رہتے ہیں، وہ روز بہ روز اپنے لوگوں کے درمیان خود اجنبی سے معلوم ہونے لگتے ہیں اور اپنے ہی لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، بالکل جس طرح انگریز برصغیر پر اپنے تسلط کے دوران انھیں دیکھا کرتے تھے۔ بالکل جس طرح میری ایک شاگرد کے ہندستانی شوہر نے، جو مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کررہے تھے، اپنی خراب اردو کے لیے معذرت کرتے ہوے کہا تھا: ''سر، ہم تو انگلش میڈیم کے گریجوئٹ ہیں اور اَپر مڈل کلاس سے تعلق رکھتے ہیں سو ہمیں اردو اتنی اچھی نہیں آتی۔ ہم اپنی فیملی میں اور فرینڈز کے ساتھ انگلش میں بات کرتے ہیں اور اردو کو سڑک پر گھومنے والے قلی اور خاکروبوں سے بات کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں!'' یہ ہے ہردل عزیز انگریزی تعلیم کے نتائج جس نے اپنے ہی ملکوں میں اور اپنے ہی لوگوں میں ایک خاص اجنبی طبقہ پیدا کردیا ہے۔ اس سے بڑھ کر انگریزی ذریعۂ تعلیم کے مضر اثرات اور مصائب کے بارے میں بات کرنے کی کیا گنجائش رہتی ہے؟ اس بات کو جانے دیجیے کہ طالبعلم سالہا سال انگریزی سیکھنے کے لیے اپنی تمام صلاحیت ضائع کرتے ہیں اور آخر میں عصری سائنس درکنار انگریزی تک کو بخوبی سیکھ نہیں پاتے!

میرے ذہن میں اُٹھنے والا ایک اور سوال یہ ہے کہ اگر برصغیر کی تمام آبادی انگریزی داں ہوگئی تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟

اب بات یہ ہے کہ اگر پاکستان اور ہندستان کے سارے کے سارے باشندے قومی یا مادری زبان کی حیثیت سے انگریزی کو اختیار کریں اور اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اسی زبان کو ذریعہ اظہار بنائیں، جیسا کہ انگلستان اور امریکہ کے باشندے کیا کرتے ہیں، تو اس صورت میں پاکستان اور ہندستان میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی؟ کیا انگریزی بولنے سے یہ دونوں ملک مزائل کی سرعت سے ترقی کرنے لگیں گے اور ایک دم میں قوت لایموت پاکر مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں کی علمی اور فنی ترقیات تک پہنچ جائیں گے؟ یا آسمان سے پیسے اور جواہرات کی بارش ہونے لگے گی جس کے ذریعے ان کے باشندے فلاح و بہبودی کی نعمتوں سے مالامال ہوجائیں گے؟ ان سوالات کا ایک ہی جواب ہوگا ''نہیں!'' اگر انگریزی یا ترقی یافتہ ملکوں کی زبانوں میں سے کسی ایک کو قومی یا سرکاری زبان بنا کر یا اُنھیں فرفر بول کر ترقی کی منازل طے ہوسکتیں تو افریقہ کے اکثر و بیشتر ممالک جن کے جنگل میں رہنے والے قبائلی تک مغربی زبان میں بات کرتے ہیں وہ اب تک یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کے ہم پلّہ بن چکے ہوتے۔ لیکن ایسا تو بالکل نہیں ہوا اور اُن کی یہ زبان دانی نہ ان کے گاؤں میں

راستہ بن کر پہنچتی ہے، نہ ڈاکٹر نہ ہی پانی اور کھانا! وہ بے چارے انگریزی بولتے ہوئے بھی بھوکے ہی رہتے ہیں یا عام اور آسانی سے قابل معالجہ بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور انگریزی یا فرانسیسی میں بات کرتے ہوئے مر جاتے ہیں۔ اور ان کو نہ انگریزی بچا پاتی ہے نہ فرانسیسی!

اِس کے علاوہ میرا سوال یہ ہے کہ اگر صرف ان لوگوں کو انگریزی زبان آئے جن کو اس کی ضرورت درپیش ہے اور باقی قوم کو نہ آئے تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟

اگر برصغیر کے سیاست دانوں کو انگریزی نہ آئے تو کیا وہ اپنے ملک کے کام نہیں چلا پائیں گے؟ یا ڈاکٹروں کو انگریزی نہ آئے تو وہ اپنے مریضوں کا علاج نہیں کر سکیں گے؟ یا لشکر کے افسر اور سپاہی اپنے ملک کی حفاظت نہیں کر سکیں گے؟ یا پولیس کے اہلکار مجرموں کو گرفتار نہیں کر سکیں گے؟ یا اگر دو افراد آپس میں بات کرتے ہوئے بیچ بیچ میں انگریزی کے فقرے نہیں گھسائیں گے تو ان کی ملاقاتیں ادھوری رہ جائیں گی؟ ایسا تو بالکل نہیں ہوگا۔ ترکی، چین، اسپین وغیرہ مختلف ملکوں میں یہ تمام کام انگریزی کے بغیر چلتے ہیں اور کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی۔

اس منطقی استخراج کے نتیجے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو ایک ایسی زبان ہے کہ جس میں تعلیمی، علمی اور ٹیکنالوجی کی زبان بننے کی تمام تر صلاحیت موجود ہے اور انگریزی کو اس کی جگہ سرکاری اور واحد تعلیمی زبان بنانے کی کوششیں بے جا اور غیر فطری ہیں۔ اردو داں طبقہ وہ کونسا کام نہیں کر سکا جو دوسرے ملکوں کے لوگوں نے کیا ہے اور کرتے آئے ہیں جن کے نتیجے میں ان کی قومی زبانیں ترقی یافتہ علمی زبان بنی ہیں۔

معروف جرمن مفکر Wilhelm von Humboldt نے ۱۸۳۶ میں، یعنی آج سے تقریباً دو صدی قبل، اپنی ایک تصنیف میں قومی زبان سے متعلق یوں تحریر کیا تھا:

> زبان ایک درونی ہستی ہے جو ایک مؤثر روح رکھتی ہو۔ افراد، اس ناقابلِ تردید مشترکہ قومی ہستی کو آپس میں بانٹتے ہیں جس سے بزرگ شخصیات جنم لیتی ہیں۔ زبان کی ہستی عمل، میلان اور تفکر کی مانند قوم کے مستقل مزاج سے تعلق رکھتی ہے اور اسی کی علامت ہے۔ زبان، ایک ایسی درونی خودی کا مظہر ہے جس کے سب سے باریک دھاگے اور بال کی جڑیں اس کی قومی روح کی طاقت سے وابستہ ہوتی ہیں۔ زبان درونی زندگی، تفکر اور دنیاوی مطمح نظر کی مشترکہ قالب ہے۔[1]

[1] A. Dilaçar, *Anadili Ilkeleri ve Türkiye Disindaki Baslica Uygulamalar* (Ankara 1978), p. 9.

Humboldt کا یہ ’’مشترکہ قالب‘‘ یا ’’درونی ہستی‘‘ ایسی لازوال قوت ہے جس کا تعلق قوموں کی ہستی اور بقا سے ہے۔ قومیں اپنی زبانوں کے ساتھ صحت مند زندگی بسر کرتی ہیں اور اپنی قومی شناخت کو برقرار رکھ کر اپنی بقا کے امکانات مہیا کرتی ہیں۔ اگر یہ مشترکہ قالب ٹوٹ جائے اور درونی ہستی ختم ہو جائے تو قوموں کی وہ روح جان کنی کی حالت میں پڑ جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ اپنی قومی شناخت کھو کر دوسری طاقتور قوموں میں جذب ہو کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ لیکن یہ عمل ایک ہی دن یا چند دہائیوں میں نہیں ہوتا۔ کبھی کبھار اسے صدیاں درکار ہوتی ہیں کیونکہ قوموں کی زندگی انسانوں کی نسبت بہت طویل ہوتی ہے اور کسی عمل کا نتیجہ ظاہر ہونے میں کتنی نسلیں گزر جاتی ہیں۔ علاوہ بریں، قوم کی موجودگی اور دوام میں زبان کا اثر اکثر مذہب سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال ہمارے سامنے ترک قوم کے گوک اوغوز (گاگاؤز) کے وہ لوگ ہیں جنھوں نے عیسائی اور سابق سوویت وفاقی جمہوریت کے حصے Moldovia کے عیسائی لوگوں کے اندر مختصر سی اقلیت ہونے کے باوجود صرف اپنی ترکی زبان بولنے کے سبب اپنی قومی شناخت برقرار رکھی اور اب تک ایک نیم خود مختار ریپبلک کی حیثیت سے زندہ ہیں۔ اس حقیقت کو جانتے ہوئے باشعور قومیں صدیوں سے اپنی زبان کی حفاظت اور ترقی کے لیے لازوال کوششیں کرتی رہی ہیں۔ چلیے اب ان باشعور قوموں میں سے چند ایک کے قومی زبان سے متعلق تجربات کے بارے میں کچھ معلومات پیش کر کے ان تجربات کی روشنی میں ’’اردو زبان‘‘ کے تجربے کی طرف آتے ہیں۔

ان تجربات کی نمایاں ترین مثالوں میں سے ایک فرانسیسی زبان کا تجربہ ہے۔ چودہویں صدی سے لے کر رونیسانس (Renaissance) کے ساتھ فرانسیسی زبان میں اطالوی، یونانی اور لاطینی زبان کے لفظوں کی جو یلغار شروع ہوئی تو فرانس کے لوگوں میں — جو اپنی قومی عصبیت اور نسل پسندی کی وجہ سے مشہور ہیں — بالخصوص ان کے خواص میں اس کے خلاف فوری ردعمل ظہور پذیر ہوا۔ انھیں دنوں میں Joachin de Bellay نامی ایک شاعر نے ۱۵۴۹ میں *Defence et Illustration de la Langue Française* کے عنوان سے ایک کتاب لکھ کر اجنبی الفاظ اور تراکیب کے خلاف احتجاجی آواز بلند کی۔ رفتہ رفتہ سترہویں صدی میں یہ احتجاج Epuration de la Language یعنی ’’زبان کو آمیزشوں سے پاک کرنے‘‘ کے نام سے ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ ۱۶۳۵ میں Academie Française یعنی فرانسیسی زبان کی اکیڈمی قائم کی گئی جس کا اصلی مقصد فرانسیسی کی مستند لغت تیار کرنا تھا۔ انھیں ابتدائی سالوں سے فرانس میں قومی زبان کی ترقی اور زبان کو آمیزشوں سے صاف کرنے کی ان تھک کوششیں شروع ہوئیں اور

جیسا کہ سب کو معلوم ہے فرانسیسی زبان دنیا کی ڈپلومیٹک اور علمی زبان بنی اور بیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں امریکہ کے عالمی سیاست اور تجارت پر قابض ہونے تک اس نے اپنا یہ مقام محفوظ رکھا۔ انگریزی زبان کے عالمی فضا پر چھا جانے پر فرانسیسی زبان میں انگریزی الفاظ کی یلغار شروع ہوئی تو فرانس کے لوگوں نے سولھویں صدی کی تحریک کی طرح ایک تحریک کا آغاز کیا اور فرانسیسی شعرا و ادبا ۱۹۳۷ میں Office de la Langue Française کو قائم کر کے اس یلغار کے خلاف جدوجہد کرنے لگے اور ۱۹۷۰ میں Haute Comite Pour la Defense et l'Expansion de la Langue Française کے نام سے فرانسیسی زبان کی حفاظت اور توسیع کی اعلیٰ تنظیم بنائی گئی جو پورے شعور اور یقین کے ساتھ فرانسیسی زبان کی حمایت اور تحفظ میں مگن ہے۔ ان صدیوں پرانی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج بھی فرانسیسی اپنی پرانی نوآبادیوں میں سرکاری زبان کے طور پر بولی جانے والی اہم ادبی اور سائنسی زبان ہے۔[1]

قومی زبان کا ایک دیگر کامیاب تجربہ جرمنی کا ہے۔ قومی یا مادری زبان کو اجنبی اثرات سے پاک کرنے کی تحریک جو اٹلی میں شروع ہوئی تھی، جس کے زیر اثر ۱۶۱۲ میں ''اطالوی زبان کی لغت'' مکمل ہوئی تھی، اس کے بعد جرمنی میں بھی قومی زبان کی تحریک کا آغاز ہوا تھا اور ۱۶۱۷ میں Die Fruchtbringende Gesellschaft کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کے مقاصد میں ''جرمنی زبان کی ہستی اور اصلی خصوصیات کی حفاظت کرنا، لوگوں کے دلوں میں قومی/ مادری زبان کی محبت پیدا کرنا، اس کی ضرورت کے مطابق استعمال کو بڑھانا اور جرمن زبان کو صاف، براق، واضح اور خوبصورت انداز سے استعمال کرنا، جرمنی زبان کو غیر ضروری اجنبی عناصر سے پاک کرنا اور اس طرح جرمن قومی شعور کو قوت پہنچانا'' شامل تھے۔ اسی سلسلے میں Leipzig یونیورسٹی کے ایک پروفیسر، بنام Christian Thomasius (۱۶۵۵-۱۷۲۸)، نے اپنی کلاسیں جرمن زبان میں پڑھانا شروع کیں اور ۱۶۸۸ میں جرمن زبان کا اولین علمی رسالہ *Monatsgesprache* شائع کیا۔ اٹھارویں صدی میں فلسفے کے پروفیسر Christian von Wolff (۱۶۷۹-۱۷۵۴) نے اپنی کلاسوں میں جرمن زبان میں مستعمل لاطینی الفاظ کے بجائے خاص جرمن لفظ استعمال کیے اور یہ ایک خوش آئند بات مانی گئی۔ اس صدی کے ایک اور پروفیسر Joachim H. Campe (۱۸۱۸ -۱۸۴۶) نے پانچ جلدوں پر مشتمل اپنی تصنیف ''جرمنی زبان کی لغت'' (*Wörterbuch der deutschen Sprance*) میں اجنبی زبان کے الفاظ اور محاورات کے

---

[1]۔ ایضاً۔ صفحہ ۱۶ تا ۱۸۔

لیے متبادل جرمن الفاظ اور محاورات تلاش کر کے نکالے تھے۔ ۱۸۴۱ میں پرانی جرمن ریپبلک پروسیا میں وزیر عدالت نے یہ حکم جاری کیا کہ سرکاری خط و کتابت اور مقدموں میں اجنبی الفاظ اور لاطینی ترکیبوں سے گریز کیا جائے۔ چند سال بعد ۱۸۴۸ میں Heildelberg میں ''عاری زبان کا ادارہ'' (Verein für die deutsche Reinsprache) قائم ہوا اور اس ادارہ کے مؤسس J. D. E. Brugger نے قومی اسمبلی کے نام اپنے مکتوب میں لکھا کہ اسمبلی کے اجلاسوں میں اجنبی الفاظ سے عاری زبان استعمال کی جائے، اور جرمن اسمبلی نے یہ گزارش بخوشی قبول کر لی۔ ۱۹۳۵ میں جرمن وزارت داخلہ کا ایک محکمہ ''جرمن زبان کی تعلیم کا دفتر'' (Deutsches Sprachflegeamt) قائم کیا گیا جس میں عصری ایجادات اور ترقیات کے ساتھ ساتھ جرمن زبان میں آنے والے نئے لفظوں اور اصطلاحات کے جرمن متبادل کامیاب طریقے سے تلاش کیے گئے تھے۔ اس کے بعد بھی جرمن زبان کے استحکام اور دوام کے لیے اقدامات جاری رہے ہیں جس کے نتیجے میں آج بھی اس زبان کا شمار دنیا کی خود کفیل اور اہم علمی زبانوں میں ہوتا ہے۔[1]

فرانس اور جرمنی کی طرح دنیا کے دیگر چھوٹے بڑے ممالک میں بھی اپنی اپنی قومی زبانوں کے تحفظ اور توسیع کی خاطر مختلف ادارے قائم کیے گئے اور ان تھک کوششیں ہوئیں۔ اٹلی میں، روس میں، چین، اسپین، انڈونیشیا، ایران اور ترکی میں، یہاں تک کہ انگلستان اور امریکہ میں بھی اپنی اپنی زبان کی ترقی اور استحکام کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے ہیں جن کے نتیجے میں یہ زبانیں اس عصر کی ہر دل عزیز زبانیں بن گئی ہیں۔ اب جرمنی، فرانس اور دیگر ملکوں کے تجربات کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو کے تجربے کی طرف آئیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیم ہند سے قبل ہندستان میں اور بعد میں پاکستان اور ہندستان دونوں ملکوں میں اردو کے تحفظ، ترقی اور ترویج کی خاطر بہت ساری کوششیں ہوئی ہیں۔ ہندستان میں دہلی کالج اور آگرہ کے انجینئر نگ کالج کے بعد ۱۸۶۳ میں سرسید احمد خان کے قائم کردہ ادارے سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں مفید انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہونے لگا۔ اسی طرح حیدرآباد میں ''دارالترجمہ'' کا قیام عمل میں آیا اور بعد میں اس سلسلے میں مختلف علمی ادارے قائم کیے گئے ہیں جن میں ترقی اردو بیورو دہلی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، اردو اکیڈمی، شعبہ تصنیف و ترجمہ کراچی، مجلس ترقی ادب، مجلس زبان دفتری، اردو سائنس بورڈ، انجمن ترقی اردو، اردو ڈکشنری بورڈ اور قومی

---

[1] ایضاً، صفحہ ۱۸ تا ۲۲۔

کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی شامل ہیں۔[1] ان اداروں نے انگریزی اور دیگر زبانوں کی مفید کتابوں کے اردو میں ترجمے کیے ہیں اور لغت نویسی اور اصطلاحات سازی کا کام بڑے عمدہ سلیقے سے انجام دیا ہے اور دے بھی رہے ہیں۔ پھر کیا بات ہے کہ ان اداروں اور اردو دوستوں کے انہماک اور دل دہی کے باوجود یہ تجربے ناکامی کا سامنا کر رہے ہیں جب کہ فرانس اور جرمنی میں یہ مساعی بڑی حد تک کامیاب رہیں؟

جیسا کہ میں نے اوپر بتایا تھا کہ اردو کے مسائل کے بارے میں بےشمار سوالات میرے ذہن میں امڈنے لگتے ہیں، بالکل اُسی طرح جب اردو کے مسائل کے حل کے متعلق سوچنے لگتا ہوں تو پھر وہی طوفان اور زیادہ شدت سے میرے ذہن میں برپا ہوجاتا ہے۔

اِس سلسلے میں سب سے پہلے میری گزارش ہے کہ دنیا بھر میں مجھے ایک ایسا ملک دکھایئے جہاں کسی نوآبادیاتی ملک کا قبضہ نہ رہا ہو اور وہاں کسی نوآبادیاتی ملک کی زبان سرکاری زبان کی حیثیت سے استعمال ہورہی ہو۔ سوچیے اور دیکھیے! آپ کو کوئی بھی ایسا ملک نہیں ملے گا۔ لیکن جن ملکوں میں انگریزی یا فرانسیسی طاقت حکمراں رہی ہو وہاں آج تک اُن کی زبانوں کا بول بالا ہے اور محکوم ملکوں کی اپنی زبانیں دوسرے درجہ کی زبان کی حیثیت سے دیکھی جاتی ہیں۔ اور حیرت اس بات پر ہے کہ جن نوآبادیاتی ملکوں نے محکوم قوموں پر صدیوں تک ظلم وستم سے حکمرانی کی ہوتی ہے، اُن کے لوگ اپنے پرانے حکمرانوں کی زبان بولنے پر کس طرح اور کیسے فخر محسوس کرتے ہیں؟ سب کو معلوم ہے کہ آزادی کی ظاہری علامتیں چار ہیں: قومی زبان، پرچم، ترانہ اور کرنسی۔ برصغیر پاک وہند میں اِن علامتوں میں سے سب سے اہم علامت کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اِس لیے خوداحتسابی کرکے آزادی کے اتنے سال بعد برصغیر کے باشندوں کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آج ہم صحیح معنوں میں آزاد ہیں بھی یا نہیں۔ یہ میرا پہلا سوال ہے۔

میرا دوسرا سوال اُن لوگوں سے ہے جو کسی نہ کسی عہدے پر فائز ہوتے ہیں اور مختلف موقعوں پر ٹی وی پروگراموں، جلسوں یا پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔ ایسے خطۂ ارض میں جس کی شرح خواندگی سب کے سامنے ہے، جہاں عالٰی معیار کی تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے، اور جہاں عام لوگوں کا ایک حصہ پڑھنے لکھنے سے بھی قاصر ہے، وہاں انگریزی میں تقریر کرنے اور بیانات دینے کا کیا فائدہ ہے؟ اِس لیے سرکاری عہدہ داروں کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم کس کی خدمت کرتے

---

[1] تحسین فراقی، ''اردو بہ حیثیت ذریعۂ تعلیم،'' قومی زبان (انجمن ترقی اردو کا صد سالہ نمبر)، جلد ۷۵، شمارہ ۱ (جنوری، فروری ۲۰۰۳)، صفحہ ۶۰ تا ۶۴۔

ہیں؟ اپنے ملک اور اپنے لوگوں کی یا کسی اور ملک کی؟

میرا تیسرا سوال اُن والدین سے، بالخصوص اُن ماؤں سے ہے جو اپنے بچوں سے اپنی زبان چھوڑ کر کسی غیر ملکی زبان میں یعنی انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جو زبان آبا و اجداد نسل در نسل بولتے چلے آ رہے ہوں اُس زبان کو اپنی محترم ماؤں کی نسبت سے ''مادری زبان'' کہتے ہیں کیونکہ ماؤں کی وساطت سے ہماری زبانیں نسل در نسل منتقل ہوتی اور زندہ رہتی ہیں۔ اگر مائیں اپنی زبانیں چھوڑ کر کسی اور کی زبان میں اپنے بچوں سے مخاطب ہونے لگیں گی تو باقی کیا رہ جائے گا؟ جیسا کہ سب کو معلوم ہے اگر کوئی دشمن ملک کسی اور ملک کو محکوم اور مغلوب کرنا چاہتا ہے تو ابتدا اُس ملک کی زبان، تہذیب اور مذہب کو خراب کر کے مٹانے سے کرتا ہے۔ اِس لیے والدین کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اُنھیں اپنی زبان اور اپنی قومی شناخت قائم رکھنا ہے یا نہیں؟

چوتھا سوال تمام برصغیر پاک و ہند کے باشندوں سے بالخصوص میرے پاکستانی بھائیوں سے ہے۔ وہ یہ کہ انگریزی کو اپنی مادری زبان بنانے کی کوشش سے یا اپنے ملک کے اندر انگریزی میں بات کرنے سے آپ کو باہر کیا عزت ملتی ہے یا ملنے کی امید ہے۔ مغربی لوگ یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ آپ انگریزی میں رواں ہیں یا نہیں اور اس خطۂ زمین کے لوگ جب اُن ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں کے لوگ کبھی مالی حالات کی خستگی کو اور کبھی دہشتگردی کو بہانا بنا کر اُن کے ساتھ بری طرح پیش نہیں آتے ہیں، اب چاہے وہ ہزار فر فر انگریزی بولتے رہیں۔ ترکی میں پاکستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور وہاں جگہ جگہ آپ کو ''جیوے جیوے پاکستان'' کہہ کر محبت سے پیش آنے والے افراد ملتے ہیں۔ پاکستانیوں کو یہ محبت اور عزت اس لیے نہیں دی جاتی ہے کہ آپ کو انگریزی آتی ہے، بلکہ اس لیے کہ مشکل وقتوں میں آپ کے آبا و اجداد نے ہمارے آبا و اجداد کی مدد کی تھی۔ یعنی عزت انگریزی جاننے سے نہیں ملتی بلکہ تہذیبی، ثقافتی، مالی اور سیاسی اعتبار سے مضبوط اور باشعور قوم ہونے سے ملتی ہے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کو عزت و محبت درکار ہے یا غیر مانوس برتاؤ؟

میرا آخری سوال میرے اُن دوستوں سے ہے جو کہتے ہیں کہ اردو ہماری مادری زبان نہیں ہے اس لیے انگریزی ہو یا اردو دونوں ہمارے لیے اجنبی زبانیں ہیں۔ آپ مجھے یہ بتایئے کہ پاکستان میں بولی جانے والی وہ کونسی زبان ہے جو پاکستان کی مختلف قوموں کو مشترکہ زبان کی حیثیت سے منوائی جا سکتی ہے؟ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا انگریزی قومی یکجہتی کی ضامن نہیں ہو سکتی ہے اور وہ ملک کے اندر ایک الگ طبقہ قائم کرتی ہے۔ پھر پاکستان کی وہ کونسی زبان ہے جو اس یکجہتی کی ضامن ہو سکتی ہے؟ سندھی، پنجابی، پشتون یا بلوچی؟

اِس سے چند سال قبل شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور، میں ''ادب میں قومی شعور'' کے موضوع پر ایک

بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اِس کانفرنس کا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ کانفرنس کے اکثر مقالے اردو میں پڑھے گئے تھے اور پاکستان کے مندوبین اردو ہی میں اپنی علاقائی زبانوں کی اہمیت اور برتری کی طرف اشارہ کرر ہے تھے۔یعنی اردو ہی وہ واحد مشترکہ زبان تھی جس میں وہ دوسروں سے اپنی علاقائی زبان کی برتری کا اعلان کر سکتے تھے۔مزید براں، جب وہ اپنی علاقائی زبانوں کی الگ شناخت اور برتری کی بات کرنے لگے تو لوگوں میں کچھ چپقلش کا سا سماں بندھ گیا اور مندوبین میں اچھا خاصا بحث ومباحثہ شروع ہو گیا۔ یعنی مندوبین میں سے کوئی بھی کسی اور علاقائی زبان کی اہمیت اور برتری کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ اِس چھوٹی سی مثال سے بھی یہ امر آشکار ہو جاتا ہے کہ اِس عالیٰ درجے کے علمی اجتماع سے لے کر پاکستان کے دور دراز علاقوں کے گلی کوچوں کے اَن پڑھ لوگ تک کسی دوسری علاقائی زبان کے مقابلے میں اردو ہی کو کھلے دل سے قبول کر کے سیکھنے اور بولنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اِس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس ہوتی کہ اردو پاکستان کے اتحاد اور یکجہتی کا واحد ذریعہ ہے۔اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہوگا کہ اتحاد اور یکجہتی چاہیے کہ نہیں؟

میرے اِن سوالات میں دراصل اردو کے مسائل کا حل بھی موجود ہے کیونکہ مسائل خودبخود نہیں بلکہ انسانوں کی ترجیحات سے پیدا ہوتے ہیں اور اردو زبان کے اِن تمام مسائل کا حل بھی آپ لوگوں کی ترجیحات پر منحصر ہے۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہوسکتا ہے میری باتیں میرے بعض عزیز دوستوں کو ناگوار گزری ہوں۔ میں اُن سے میں معذرت چاہتا ہوں لیکن کیا کروں میں دل کی بات کہتا ہوں اور اگر اردو کے مسائل حل کرنا ہیں تو ہم سب کو سچے دل کے ساتھ اپنا حساب لینے کی ضرورت ہے۔ □